بَحیرہ راہب سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اکتساب علم......افسانہ یا حقیقت

احسان الرحمٰن غوری*

عبدالستار غوری**

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیمات سے متعلق کبھی بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ یہ اُن کے اپنے تخیل کی پیداوار ہیں۔ اللہ تعالیٰ قرآن میں اُن کے متعلق کہتے ہیں کہ:

﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِىْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِىْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا وَاِنَّكَ لَتَهْدِىْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ (۱)

''اور اسی طرح ہم نے آپ کی طرف اپنے حکم سے روح کو اتارا ہے۔ آپ اس سے پہلے یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ کتاب اور ایمان کیا چیز ہے۔ لیکن ہم نے اسے نور بنایا، اس کے ذریعہ سے اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں۔ بے شک آپ راہِ راست کی رہنمائی کر رہے ہیں۔''

متعدد معاندین اسلام نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت اور اُن کی تعلیمات کے حوالے سے یہ اعتراض کرتے ہیں کہ آپؐ کا پیغام یہودیت اور مسیحیت سے ماخوذ ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اسلام دراصل ابراہیمی سلسلۂ ادیان کی آخری، کامل اور محفوظ ترین شکل ہے۔ ان ابراہیمی یا سامی ادیان کے بنیادی عقائد مشترک ہیں یعنی توحید، رسالت اور آخرت۔ البتہ عبادات و معاملات کی دیگر تفصیلات میں اسلام مسیحیت اور یہودیت کے مقابلے میں زیادہ کاملتفصیلات رکھتا ہے۔ علاوہ ازیں قرآنِ حکیم نے یہ بات بھی صراحت کے ساتھ بیان کردی ہے کہ بنی نوع انسان کے لیے اللہ نے ہدایت کا مستقل سامان کیے رکھا۔ اور ہر دور میں ہر قوم کے لیے ایک ہادی ضرور بھیجا۔

تمام الہامی مذاہب ایک ہی مقصد لے کر ظہور پذیر ہوئے: انسانیت کی ہدایت۔ پیغمبر اسلام نے کبھی بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اسلام ایک نیا اور انوکھا مذہب ہے۔ قرآن نے اس حقیقت کو بھی بہت واضح انداز سے بیان کیا ہے:

قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَآ اَدْرِىْ مَا يُفْعَلُ بِىْ وَلَا بِكُمْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَىَّ وَمَآ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (۲)

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامیات، پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔

** ریسرچ فیلو، المورد، لاہور۔

''(اے نبی) آپ کہ دیجیے کہ میں کوئی بالکل انوکھا پیغمبر تو نہیں۔ نہ مجھے یہ معلوم ہے کہ میرے ساتھ اور تمھارے ساتھ کیا کیا جائے گا۔ میں تو صرف اسی کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی بھیجی جاتی ہے۔ اور میں تو صرف علی الاعلان آگاہ کردینے والا ہوں۔''

اسلام اور دیگر سامی مذاہب (یہودیت اور مسیحیت) کی چند قدریں مشترک ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اِن تینوں مذاہب کا مأخذ ایک ہی ہے۔ تاہم اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا مأخذ بائبلی روایات ہوں۔ بعض مستشرقین نے اس امکان کو رد کیا ہے کہ اسلام مذکورہ دونوں ادیان کی تعلیمات سے مأخوذ ہے۔ پروفیسر منٹگمری واٹ لکھتے ہے:

The possibility of his having read the Bible or other Jewish or Christian books may be ruled out. (....); and it is unlikely that he had ever read any other books. (۳)

''اس بات کا امکان قابل رد ہے کہ انھوں (محمدؐ) نے بائبل یا دیگر یہودی یا مسیحی کتب کو پڑھا ہو (......)۔ اور یہ غیر متوقع امر ہے کہ انھوں نے کبھی بھی کوئی کتاب پڑھی ہو۔''

مارشل نے بھی انھی خیالات کا اظہار درج ذیل الفاظ میں کیا ہے:

"Muhammad's standard for prophecy was, in principle, the experience and action of the old Hebrew prophets. But he knew nothing of them directly. His own experience was evidently very personal."(۴)

''محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے الہام کا معیار بنیادی طور پر قدیم یہودی انبیا کے تجربات اور اعمال کے مماثل تھا۔ لیکن وہ اِن سب سے ناواقف تھے۔ واضح طور پر یہ آپ کے اپنے ہی تجربات تھے۔''

اسلام ایک ضابطۂ حیات ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کے ذریعے نازل کیا تا کہ اس کے اس کے ذریعے تمام بنی نوع انسان کو رہتی دنیا تک کے لیے رہنمائی مہیا کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ان ادیان کی بنیادی تعلیمات اپنی اصلیت اور اپنے مقاصد کے لحاظ سے مشترک ہیں۔ اِن تینوں الہامی مذاہب کا جوہری طور پر باہمی مختلف ہونا بظاہر محال لگتا ہے کیونکہ تینوں کا مأخذ و منبع ایک ہی ہے۔ بنیادی تعلیمات مشترک ہیں: خالق کائنات ایک ہی ہے؛ وہی ہر چیز کا پروردگار ہے؛ اس کا کوئی ہم سر و ساتھی نہیں ہے؛ حیات بعد الموت شدنی امر ہے؛ قتل، زنا، جھوٹ، چوری، ظلم وغیرہ گناہ کے کام ہیں اور ان کی سزا مقرر ہے؛ رحم دلی، سچائی، خیرات، مخلوقات کی خدمت اور سماجی بہبود وغیرہ نیکی کے کام ہیں؛ لاکھوں سال قبل تک بھی یہ اچھائی تصور کی جاتی تھی، آج

بھی یہی حقیقت ہیں اور سینکڑوں ہزاروں سال بعد میں بھی یہ ہی راست اقدامات تصور ہوں گے۔ چنانچہ یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ کسی ایک پیغمبر کی تعلیمات دوسرے کسی پیغمبر سے مختلف ہوں، چاہے ان دونوں پیغمبروں کے درمیان ہزاروں سال کا بُعد ہو۔ تاریخی واقعات کا بھی تقریباً یہی معاملہ ہے۔ تاہم ان میں فرق یہ ہے کہ تاریخی واقعات کے لکھنے اور مدون کیے جانے کے عمل کے دوران میں کچھ الحاقی مواد بھی شامل ہوجاتا ہے۔ اس حقیقت کا ادراک مستشرقین کو بھی کرنا چاہیے اور اپنی تحریروں میں اس کا لحاظ رکھنا چاہیے، نہ کہ ایسی بے بنیاد باتیں لکھ کر اپنے قارئین کو گمراہ کیا جائے۔ اس ضمن میں قرآن کریم کا بیان ہے کہ:

﴿شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ . وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْم بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًام بَيْنَهُمْ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْم بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ﴾ (۵)

پیغمبر اسلام اُمی نبی تھے۔ آپ کا کسی بھی مذہبی رہنما سے کوئی رابطہ تھا اور نہ ہی آپ کو کسی مذہبی عالم سے علم حاصل کرنے یا ان کی شاگردی اختیار کرنے کا موقع ملا۔ ایک روایت ہے کہ نبی اکرمؐ نے ایک تجارتی قافلے میں اپنے سرپرست ابوطالب کے ساتھ شام کا سفر کیا۔ روایات کے مطابق آپؐ کی عمر مبارک اُس وقت نو یا بارہ سال تھی۔ قافلے نے بُصریٰ کے مقام پر پڑاؤ ڈالا۔ بُحیرہ یا بَحیرہ نامی راہب نے آپ کو پہچان لیا کہ آپ ہی مالک کائنات کے رسول ہیں۔ جب اُس راہب سے پوچھا گیا کہ اس نے کیسے جانا کہ یہ ہونے والے نبی ہیں۔ اس نے بتایا کہ ہر درخت اور پتھر نے آپ کو سجدہ کیا اور یہ کسی پیغمبر ہی کے سامنے جھکتے ہیں۔ بحیرہ راہب ہی کی ہدایت کے مطابق حضرت ابوطالب نے آپؐ کو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت بلالؓ کے ہمراہ واپس مکہ بھیج دیا۔ متعدد مستشرقین نے اسے واقعے کو اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے اور اس بات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے کہ پیغمبر اسلام نے نبوت کی بنیادی ہدایات اسی بحیرہ راہب سے اخذ کی ہیں۔

سیرت نبویہ کی یہ روایت حدیث کے مختلف مجموعوں میں کئی اسناد کے ذریعے نقل ہوئی ہیں۔ ان میں سے سب سے مضبوط سند امام ترمذیؒ نے بیان کی ہے۔ دیگر تمام اِسناد درجۂ صحت سے اتنی فروتر ہیں کہ کسی بھی محدث نے ان کا ذکر تک نہیں کیا۔ امام ترمذیؒ کی بیان کردہ روایت میں سلسلۂ روایت درج ذیل ہے:

امام ترمذی روایت کرتے ہیں فضل بن سہل سے، وہ عبدالرحمٰن بن غزوان سے، وہ یونس بن ابی اسحٰق سے، وہ ابی بکر بن ابی موسیٰ سے، وہ اپنے والد ابوموسیٰ اشعریؓ سے، انھوں نے فرمایا کہ ابوطالب شام کے سفر کے لیے نکلے۔ (۶)

مولانا شبلی نعمانی رحمہ اللہ سیرۃ النبی میں اس واقعے سے متعلق اپنے تجزیاتی مشاہدات پیش کیے ہیں۔ اُن کے مشاہدات کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

اگر چہ (اس سلسلۂ روایت میں) ایک راوی عبدالرحمٰن بن غزوان کو اسماء الرجال کے چند ناقدین نے ثقہ قرار دیا ہے۔ تاہم بعض دوسرے علماء کرام نے ان کی ثقاہت پر الزامات لگائے ہیں۔ علامہ ذہبی اپنی کتاب میزان الاعتدال میں لکھتے ہیں:

''عبدالرحمٰن منکر احادیث روایت کرتا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ ناقابل قبول روایت بحیرہ کے قصے سے متعلق ہے۔ ممالیک سے متعلق ایک موضوع حدیث بھی اسی سے مروی ہے۔ حاکم لکھتے ہیں: اس نے منکر روایت امام لیث سے نقل کی ہے۔ ابن حبان لکھتے ہیں: یہ غلطی کا مرتکب ہوتا ہے۔

اس راوی (عبدالرحمٰن) نے یہ روایت یونس بن اسحٰق سے نقل کی ہے۔ چند نقادوں نے یونس کو قابل اعتبار راوی گردانا ہے۔ تاہم عمومی طور پر یہ کمزور اور غیر معتبر راوی سمجھے جاتے ہیں۔ یحییٰ کہتے ہیں: یہ بہت لاپرواہ اور غیر محتاط راوی تھا۔ شُعبہ نے اس پر غلط بیانی اور دھوکے کا الزام لگایا ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ رحمہ اللہ نے اس سے مروی روایات کو عموماً بے وقعت قرار دیا ہے۔

یونس بن اسحٰق نے یہ روایت ابوبکر سے بیان کی۔ جو اسے اپنے والد ابوموسیٰ العشری سے روایت کرتے ہیں۔ لیکن اس بات کا قطعی ثبوت موجود نہیں ہے کہ ابوبکر نے کوئی حدیث اپنے والد ابوموسیٰ العشری سے سنی ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ نے ان کے سماع کو مکمل طور پر رد کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابن سعد نے انھیں کمزور راوی قرار دیا ہے۔ لہٰذا یہ روایت منقطع قرار دی جائے گی۔'' (۷)

سیرۃ النبی میں مذکور رواۃ کے اس مختصر تذکرے کے بعد ذیل میں ان راویوں کی ثقاہت کا تفصیلی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

ابتدا میں سب سے پہلے راوی صحابی رسول حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ابن الاثیر ان کے متعلق بیان کرتے ہیں:

''علم الانساب اور سوانح نگاروں کی ایک جماعت اس بات کی قائل ہے کہ ابوموسیٰ مکہ آئے اور سعید بن العاصؓ سے معاہدہ کیا اور اس کے بعد اپنے قبیلے کی جانب لوٹ گئے۔ (قریباً دس سے پندرہ سال بعد) آپ اپنے بھائیوں کے ہمراہ دوبارہ مکہ آئے۔ اتفاق سے عین اسی وقت خیبر کی فتح کے بعد حبشہ کے مہاجرین بھی واپس آرہے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی کشتی ہوا کے زور سے نیگروؤں کے علاقے میں پہنچ گئی، جہاں انھوں نے کچھ عرصہ قیام کیا۔ تب وہ حبشہ سے مدینہ واپس جانے والے مہاجرین کے ساتھ ہولیے۔'' (۸)

ابوموسیٰؓ ۴۲-۵۳ھ کے دوران میں کسی وقت فوت ہوئے۔ جبکہ ان کی عمر ۶۳ برس تھی۔ (۹)

حافظ شمس الدین الذہبی نے ان کے متعلق بہت تفصیلی معلومات اکٹھی کی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ابوموسیٰ ۴۲ھ میں فوت ہوئے۔ ابواحمد الحاکم کے بقول وہ ۴۲ھ میں فوت ہوئے اور ۴۳ھ کا بھی ذکر ملتا ہے۔ ابونعیم، ابوبکر بن ابی شیبہ، ابن نمیر اور قعنب بن المحرر بیان کرتے ہیں کہ آپ ۴۴ھ میں فوت ہوئے تھے۔ جہاں تک واقدی کا تعلق ہے، وہ کہتے ہیں: وہ (ابوموسیٰ اشعری) ۵۲ویں سال میں فوت ہوئے؛ اور

المدائنی کے بقول آپ ۵۳ ویں سال میں المغیرہ کے بعد فوت ہوئے۔ اور میں نے طبقات القریٰ میں ذکر کیا ہے کہ حقیقت یہی ہے کہ ابوموسیٰ ذی الحجہ ۴۴ھ میں فوت ہوئے۔" (۱۰)

ایسی ہی معلومات ابن حجر العسقلانی رحمہ اللہ (۱۱) اور ابن سعد (۱۲) نے بھی ذکر کی ہیں۔ مذکورہ بالا حقائق سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ:

ا۔ ابوموسیٰ اشعریؓ ۶۳ سال کی عمر میں فوت ہوئے۔

ب۔ وہ ۴۲ تا ۵۳ھ کے دوران کے سالوں میں فوت ہوئے۔ اور زیادہ غالب امکان یہی ہے، جیسا کہ امام ذہبیؒ نے لکھا ہے، کہ آپ ۴۴ ھجری میں فوت ہوئے۔

ج۔ اگر آپ نے ۴۲ھ میں وفات پائی تو گویا آپ کی پیدائش کے وقت حضرت محمد ﷺ کی عمر مبارک ۳۲ سال تھی یعنی بحیرہ راہب کے واقعہ کو گزرے ۲۰ سے ۲۳ سال ہو چکے تھے۔

د۔ اگر آپ نے ۵۳ھ میں وفات پائی تو غالباً آپ پیدائش کے وقت حضرت محمدؐ کی عمر ۴۴ سال ہوگی۔ گویا بحیرہ راہب والے واقعے کے ۳۱ سے ۳۴ سال بعد۔

ہ۔ کسی بھی طرح حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اس واقعے کے عینی شاہد نہیں ہو سکتے جو ان کی پیدائش سے بھی ۲۰ تا ۳۴ سال قبل وقوع پذیر ہوا۔ اور آپ کی بلوغت سے بھی ۳۰ سے ۴۰ سال پہلے کا واقعہ جب آپ اس قابل ہو سکتے تھے کہ ایسے واقعے کو کسی حد تک سمجھ یا یاد رکھ سکتے تھے۔

عینی شاہد نہ ہونے کے باوجود حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کا یہ بیان قابل قبول ہے اگر انھوں نے یہ روایت کسی ایسے راوی سے سنی ہو جس نے براہ راست نبی اکرمؐ سے یہ واقعہ سنا ہو۔ ایسے کسی بیان کی غیر موجودگی میں سلسلۂ رواۃ منقطع سمجھا جائے گا اور ایسی روایت کو مرسل روایت کہتے ہیں۔ اس سے روایت میں ضعف پیدا ہو جاتا ہے۔ اس ضعف کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تب بھی اس روایت کی سند میں چند ایسی کمزوریاں ہیں جو اسے بالکل نا قابل قبول بنا دیتی ہیں۔

ابوبکر اس روایت کو اپنے والد ابوموسیٰ اشعریؓ سے نقل کرتے ہیں۔ یہ بات محل نظر ہے کہ انھوں نے اپنے والد سے کبھی کوئی روایت سنی ہو۔ ابوبکر ۱۰۶ھ (۱۳) میں وفات پا گئے تھے جبکہ ان کے والد ابوموسیٰ اشعریؓ ۴۲ھ (۶۳ سال کی عمر) (۱۴) میں فوت ہوئے۔ امام شمس الدین الذہبی کا قول اوپر نقل کیا گیا ہے، جس کے مطابق حضرت ابوموسیٰ ۴۴ ھجری یا مابعد فوت ہوئے۔ (۱۵) گویا ابوبکر اپنے والد کی وفات کے بعد ۶۴ سال یا اس سے زیادہ زندہ رہے۔ وہ اپنے والد کی وفات کے وقت اپنے لڑکپن میں ہوں گے۔ امام احمد بن حنبلؒ نے اس قسم کے کسی بھی امکان کو رد کیا ہے۔ ابن سعد کہتے ہیں کہ وہ ایک کمزور اور نا قابل اعتبار راوی ہے۔ حافظ یوسف مزیؒ کے بقول اُن کا نام عمر دیا عامر تھا۔ مزید لکھتے ہیں:

''اس نے الاسود بن ہلال، برہ بن عازب، جابر بن سمرہ، عبداللہ بن عباسؓ، علی بن ابی طالبؓ اور جیسا کہ مشہور ہے کہ یہ ایک غلط فہمی ہے کہ اپنے والد ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایتیں بیان کی جاتی ہیں۔''(۱۶)

ابوبکر سے یہ روایت یونس بن اسحٰق نے بیان کی ہے۔ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ یونس بن اسحٰق کمزور، غیر معتبر، غیر محتاط راوی ہے۔ ابو حاکم کا کہنا ہے کہ اس کی روایت کردہ حدیث پڑھ کر وہ مخمصے اور واہمے میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ چند ائمہ حدیث انھیں قابل قبول سمجھتے ہیں تاہم جمہور ائمہ حدیث کے نزدیک یہ غیر معتبر راویوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ حافظ مزی نے ان کے متعلق کافی تفصیل سے لکھا ہے۔ حافظ مزی کی بیان کردہ چند گزارشات کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا۔

صالح بن احمد بن حنبلؒ، علی بن المدائینی کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ وہ یحیٰ (کی محفل میں بیٹھے) اُن (کا وعظ) سن رہے تھے۔ جب یونس بن اسحٰق کا تذکرہ آیا تو انھوں نے کہا اس میں توجہ اور احتیاط پسندی کا فقدان تھا اور یہ اس کی قدرتی اور پیدائشی کمزوری تھی۔ سلم بن قتیبہ کے حوالے سے بُندر کہتے ہیں کہ میں (سلم بن قتیبہ) کوفہ سے آیا۔ شعبہ نے مجھ سے پوچھا تم وہاں کس سے ملے۔ میں نے کہا فلاں فلاں سے، اور میں یونس بن اسحٰق سے بھی ملا۔ انھوں نے پوچھا اس نے کون سی (حدیث) بیان کی۔ میں نے بیان کی (جو ان سے سنی تھی)۔ وہ چند لمحے خاموش رہے۔ میں انھیں بتایا کہ اُس (یونس بن اسحٰق) نے کہا کہ بکر بن باعظ نے مجھے حدیث بیان کی۔ شعبہ نے کہا کیا اُس نے یہ نہیں کہا کہ عبداللہ بن مسعودؓ نے مجھے وہ حدیث سنائی؛ (جو واضح طور پر ایک ناممکن امر ہے کیونکہ دونوں شخصیات کے درمیان لمبے عرصے کا فرق ہے۔ گویا شعبی اسے وضاعِ حدیث گردانتے ہیں)۔ ابوبکر الاثرم کہتے ہیں: میں نے ابوعبداللہ کو کہتے سنا ہے۔ جب یونس بن ابی اسحٰق کا ذکر آیا تو انھوں نے اس کی اپنے باپ سے بیان کردہ روایات کو غیر معتبر روایات گردانا ہے۔ ابوطالب نے احمد بن حنبل کو بتایا کہ یونس بن اسحٰق اپنی بیان کردہ ایک حدیث میں بعض لوگوں کے کہنے کے بموجب اضافہ کر دیا۔ اس کا بیٹا اسرائیل بن ابی اسحٰق سے حدیث سنتا اور اسے نقل کرتا۔ لیکن جتنی روایات میں یونس بن اسحٰق اپنی طرف سے اضافہ کرتا، اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ ہوتا۔ عبداللہ بن احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''میں نے اپنے والد سے یونس بن اسحٰق کی بابت دریافت کیا''۔ انھوں نے بتایا کہ اس کی روایات بے ترتیب اور بے ربط ہیں (...)۔ اس کی علمی حیثیت ابھی غیر متعین ہے''۔ ابوحاتم فرماتے ہیں کہ: یہ صاف گو تو تھا لیکن اس کی بیان کردہ روایات مستند ہیں اور نہ کسی معاملے کے ثبوت کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے۔ امام نسائی انھیں قابل قبول مانتے ہیں۔ ان کے بقول اس کی روایات میں کوئی حرج نہیں۔ وہ ۱۵۹ھ یا ۱۵۲ھ یا ۱۵۸ھ میں فوت ہوا۔ پہلی تاریخ زیادہ راجح ہے۔(۱۷)

دوسرے راوی عبدالرحمٰن بن غزوان ہیں۔ زیادہ تر علماءِ اسماء الرجال نے انھیں بڑا مضبوط، معتبر اور قابل قبول راوی بیان کیا

ہے۔تاہم ان کی شخصیت کسی بھی الزام سے بری نہیں ہے۔امام مزیؒ ان کے متعلق اپنی رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ابن حِبان نے ان کے متعلق بتایا ہے کہ یہ غلطیوں کے مرتکب ہو جاتے تھے۔ان کی المما لیک کے قصے کے متعلق بیان کردہ روایت جو انھوں نے لیثؒ ، مالکؒ ، زہریؒ ، حضرت عروہؓ اور حضرت عائشہؓ سے روایت کی ہیں وہ دل میں شکوک وشبہات پیدا کرتی ہے۔محمد ابن جریر طبری کہتے ہیں کہ وہ ۲۰۷ ھ میں انتقال فرما گئے تھے۔''(۱۸)

اب صرف ایک راوی فضل بن سہل الاعرج کا معاملہ زیر بحث ہے۔اگر چہ وہ ایک مشہور راوی تھے لیکن ان کی شخصیت کے بارے میں چند اعتراضات بھی وارد ہوئے ہیں۔خطیب بغدادی بیان کرتے ہیں:

''مجھے خبر دی ہے احمد بن سلیمان بن علی المقری، ابوسعید احمد بن محمد المالینی، عبداللہ بن عدی وہ کہتے ہیں'' میں نے ابدن سے سنا ہے کہ اس نے ابوداؤد السجستانی کو یہ کہتے سنا کہ وہ فضل الاعرج سے (بعض روایات) نقل کرنا پسند نہ کرتے تھے۔میں نے پوچھا وہ کیوں؟ انھوں نے کہا کہ (یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ) کوئی اچھی حدیث بھی ان کے پاس محفوظ نہ ہو۔ابن عدی فرماتے ہیں کہ انھوں نے احمد بن الحسین الصوفی کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ فضل بن سہل الاعرج لومڑی کی طرح چالاک اور دھوکے باز شخص تھا۔''(۱۹)

یہ بات قابل توجہ ہے کہ اگر سند میں کوسی ایک راوی پر بھی طعن کی جائے یا سند منقطع ہو یا سب سے پہلا راوی اس واقعے کا حصہ یا عینی شاہد نہ ہو تو پوری سند ہی مشکوک ہو جاتی ہے اور وہ روایت یا حدیث غیر معتبر ٹھیرتی ہے۔مذکورہ صدر حدیث میں کسی ایک راوی کا تو ذکر ہی کیا زیادہ تر راوی کسی نہ کسی حوالے سے مجروح ہیں۔دوسرے یہ کہ اس روایت کی سند منقطع سمجھی جائے گی۔ اور سب سے اہم بات یہ کہ پہلا راوی اس پورے واقعے کا حصہ ہے اور نہ ہی عینی شاہد ہے۔یہ حیران کن امر ہے کہ سند میں موجود اتنے شبہات کے باوصف ایک علمی تجزیہ نگار اس روایت کو کہیں حوالے کے طور پر کیسے پیش کرسکتا ہے۔اور ایک ایسے اہم واقعے کے متعلق یہ روایت ثبوت کے طور پر بیان کرنا جس کا تعلق نبیؐ کی دینی تعلیمات کے بینادی ماخذ سے ہے قابل تحسین بات نہیں۔

علم روایت کی رو سے مذکورہ سند کا تجزیہ کرنے کے بعد علم درایت کے حوالے سے اس کے مندرجات کا بغور مطالعہ بھی ضروری ہے۔اس روایت کا متن ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

قریش کے بعض رؤسا کے ہمراہ ابوطالب رسول کریمؐ کو ساتھ لے کر شام کے سفر کو نکلے۔خانقاہ کے پاس پہنچ کر انھوں نے پڑاؤ کیا۔(اس خانقاہ کا) راہب اُن کے پاس آیا حالانکہ اس سے پہلے وہ کبھی بھی ایسے کسی قافلے کی جانب آیا تھا اور نہ اس پر کبھی توجہ کی۔جب قافلے والے اپنا سامان اتار رہے تھے تو وہ راہب ان کے پاس سے گزرتا ہوا نبی کریم کے پاس آیا اور اُن کا ہاتھ پکڑ کر کہا، ''یہ جہانوں کا سردار ہے، مالکِ کائنات کا پیغمبر ہے، اللہ انھیں تمام جہانوں کے لیے رحمت بنائیں گے''۔سردارانِ قریش نے پوچھا کہ اسے اس بات کی خبر کیسے ہوئی؟ اس نے

بتایا" جب تم لوگ گھاٹی میں سے نمودار ہوئے تو تمام نباتات و جمادات ان کے سامنے جھک گئے۔ اور یہ نبی کے علاوہ کسی کو سجدہ نہیں کرتیں۔ میں نے ان کے کندھوں کے نیچے موجود سیب کی مانند مہر نبوت کی بدولت بھی انہیں پہچان لیا۔ تب وہ لوٹا اور قافلے والوں کے لیے کھانا تیار کروایا۔ جب وہ کھانا لے کر پہنچا تو آپ (یعنی مستقبل کے نبی) اونٹوں کے ریوڑ کے پاس تھے۔ راہب نے آپ کو بلایا۔ آپ آئے اور ایک بادل کا ٹکڑا کہ آپ پر سایہ کیے ہوئے تھا۔ جب آپ لوگوں کے پاس پہنچے تو آپ نے دیکھا کہ لوگ پہلے ہی سایہ بردار جگہوں پر بیٹھ چکے ہیں۔ آپ ایک جگہ بیٹھ گئے تو لوگوں نے دیکھا کہ درخت کا سایہ آپ کی جانب جھک گیا۔ راہب نے کہا دیکھو درخت کا سایہ ان کی جانب سرک آیا ہے۔ وہ (راہب) ابھی تک قافلے والوں کے ساتھ تھے اور بہت احترام کے ساتھ ان سے درخواست کی کہ اس (نبی ﷺ) کو بازنطینی علاقے کی طرف نہ لے کر جائیں کیونکہ جیسے ہی رومیوں نے آپ کو دیکھا وہ آپ کو پہچان جائیں گے اور قتل کر دیں گے۔ تب اچانک سات بازنطینی افراد نمودار ہوئے۔ اس (راہب) نے انھیں خوش آمدید کہا اور ان سے آنے کا مقصد دریافت کیا۔ انھوں نے کہا ہمارے علم میں یہ بات آئی ہے کہ اس مہینے میں وہ نبی (موعود اپنے گھر سے) باہر آئیں گے۔ چنانچہ لوگوں کو چاروں طرف بھیج دیا گیا ہے۔ اور ہمیں اس راستے کی طرف بھیجا گیا ہے۔ راہب نے کہا۔ کہ تمہارے پیچھے تمھارا کوئی سردار بھی آ رہا ہے؟ انہوں نے کہا کہ وہ سب سے زیادہ معزز ہونے کی وجہ سے اس راستے کی جانب بھیجے گئے ہیں۔

راہب نے ان سے کہا کیا تم نے اس بات پر غور کیا ہے کہ جس ارادے کی تکمیل کا اللہ تعالیٰ نے پکا ارادہ کر لیا ہوا سے کوئی دوسرا اکمل ہونے سے باز رکھ سکتا ہے؟ اُن کے منفی جواب کے بعد اس نے انھیں پر زور طریقے سے قائل کیا کہ وہ اس کی وفاداری کا وعدہ کریں۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اس کی سنجیدہ درخواست کے نتیجے میں لوگوں نے اسے بتایا کہ ابو طالب اِن (نبیؐ) کے سرپرست ہیں۔ اس (راہب) کے مسلسل اصرار پر ابو طالب نے آپؐ کو ابو بکرؓ اور بلالؓ کے ہمراہ (ابو بکر نے آپ کو بلال کے ہمراہ بھیجا جو مناسب ترجمہ نہیں لگتا) واپس (مکہ) بھجوا دیا۔ راہب نے ان کو راستے کے لیے روغن اور روٹی کا ٹکڑا پیش کیا۔ (۲۰)

مذکورہ متن کا ناقدانہ جائزہ لینے سے اس میں موجود بعض خامیوں کا پتا چلتا ہے۔ چند مشاہدات درج ذیل ہیں۔

1۔ ابو طالب کبھی بھی خوشحال نہ ہوئے۔ وہ اس حد تک غریب اور مجبور تھے کہ خود اپنے بچوں کی کفالت کے قابل نہ رہے تھے۔ آپ کے چند قریبی رشتہ داروں نے جو آپ پر مہربان تھے۔ آپ کے چند بچوں کی پرورش کی ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی۔ ایک امیر شخص ہی تجارتی سرگرمیوں میں حصہ لے سکتا ہے۔ تجارتی قافلوں کے ساتھ دوسرے ممالک میں جا سکتا ہے۔ جبکہ ابو طالب اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ روایت بظاہر بعید از قیاس

5۔ مستشرقین نے اس واقعے کو اپنے اس دعوے کی دلیل کے طور پر لیا ہے کہ حضرت محمد ﷺ نے اپنی پیش کردہ دینی تعلیمات دراصل مسیحی عقائد سے بذریعہ بحیرہ راہب سیکھیں اور اخذ کی ہے۔ اگر مستشرقین اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ یہ واقعہ ایک حقیقت ہے نہ کہ فسانہ۔ مخلصانہ طور پر اس واقعہ کی تحقیق وجستجو کرتے تو اسلام کے بارے میں ان کا رویہ بالکل مختلف ہوتا۔ جبکہ اُن کا موجودہ رویہ اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ وہ خود اس راہب کی صداقت پر یقین نہیں رکھتے۔

6۔ اگر یہ بات ہوتی کہ تمام درخت اور پتھر محمد ﷺ کے سامنے جھک گئے تو یہ بات صرف اسی سفر تک محدود نہ رہتی۔ سیکڑوں، ہزاروں لوگوں نے مکہ اور دیگر علاقوں میں اس چیز کا مشاہدہ کیا ہوگا۔ لیکن حدیث کی کسی کتاب میں صحیح روایت نہیں ملتی کہ جس میں اس معجزے کا تذکرہ موجود ہو۔ لہذا یہ ایک بے حقیقت روایت ہے۔

چنانچہ اس حقیقت کا بآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ نبی کے سامنے کسی بھی صورت میں جھکنا ممنوع ہے۔

7۔ جہاں تک مہر نبوت کا تعلق ہے، بائبل میں اس کے متعلق کوئی واضح تذکرہ نہیں ملتا۔ اگر یہ مہر واقعی نبیؐ کے کندھے پر موجود ہوتی، جیسا کہ اس روایت کے مطابق راہب نے اس کی تصدیق کی، تو یقیناً قریش کے کسی صالح عالم یا رہنما کے لیے پیغمبر اسلام کے اس دعوے کی صداقت سے کنارہ کشی کا کوئی جواز باقی نہ رہ جاتا۔ نتیجتاً وہ انھیں اللہ کا رسول مان لیتے اور ان کے پیش کردہ دین کو سچا جانتے۔ یہ حقیقت ہے کہ آپ کی کمر کے اوپری حصے (کندھے کی ہڈی کے نیچے) پر ایک غدود نما گلٹی موجود تھی۔ تاہم آپؐ نے کبھی بھی اسے اپنی نبوت کے دعوے کے طور پر پیش نہیں کیا۔ اگر اس کا آپؐ کی نبوت سے کچھ بھی تعلق ہوتا تو یقیناً آپؐ اس کے متعلق خصوصی رویہ اپناتے۔ آپ کی یہ لاتعلقی ظاہر کرتی ہے کہ یہ گلٹی کوئی غیر فطری چیز یا معجزہ نہیں ہے۔ چنانچہ یہ دلیل بھی اس روایت کو بے وقعت قرار دیتی ہے۔

8۔ اگر یہ واقعہ کسی خوش فہم بے وقوف دوست یا چالاک دشمنِ اسلام راوی کی اختراع نہ ہو بلکہ ایک صحیح واقعہ ہو تو لازماً نبی کریمؐ نے اسے اپنی نبوت کے لیے واضح علامت کے طور پر بیان کیا ہوتا۔ اور حضرت محمد ﷺ کے ہم عصر کافروں کے لیے ایسی واضح اور ٹھوس نشانی کو سرے سے مسترد کر دینا بہت ہی مشکل امر ہوتا۔

9۔ متذکرہ بالا مشاہدات کا اطلاق پیغمبر اسلام کے اوپر بادلوں کے سایہ کرنے والے معاملے پر بھی ہوتا ہے۔ یہی مشاہدات درخت کے ایک طرف جھکنے اور نبیؐ پر اپنا سایہ ڈالنے والے معاملے پر بھی مکمل طور لاگو ہوتے ہیں۔

10۔ بحیرہ راہب قافلے والوں کو بڑے اصرار کے ساتھ منع کرتا ہے کہ اس لڑکے کو بازنطینی علاقے میں نہ لے جایا جائے۔ کیونکہ وہ لوگ لڑکے کو دیکھتے ہی اس کی نشانیاں پہچان جائیں گے اور اسے قتل کر دیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس آنے والے نبیؐ کے ظہور کی علامات اتنی صراحت کے ساتھ بائبل میں درج ہیں کہ یہ علامتیں کسی صورت بھی رومی بزرگوں کی نظروں سے بچ نہ سکتی تھیں۔ کیا یہ فاضل مستشرقین راہب کے ان خیالات سے متفق ہیں۔ اور اگر یہ اس راہب

کی بات کو سچ مانتے ہیں تو کس حد تک وہ اس سچائی کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں؟ کیا یہ اہل علم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ نبی اسلام کی بابت علامات بائبل میں اتنے سادہ اور واضح انداز سے مذکورہ ہیں کہ بائبل کا کوئی عالم اس نبی ﷺ کو اس کے اوائل عمر ہی میں صرف ایک نگاہ میں پورے یقین کے ساتھ پہچان جاتے۔ جیسا کہ راہب کا خیال ہے۔

11۔ جہاں تک اس روایت میں مذکورہ اُن سات بازنطینی اکابرین کا یہ کہنا کہ وہ نبی اس ماہ کے دوران میں اپنی جائے رہائش میں نہیں ہے اُن کی اس معلومات کا مآخذ کیا ہے؟ جہاں تک بائبل کا تعلق ہے اس میں ایسی کوئی پیشین گوئی مذکور نہیں۔ عجیب بات ہے کہ ان فاضل مستشرقین نے ایسی موضوع روایت کو بنیاد بنا کر اتنا بڑا محل قائم کر دیا ہے جس کی اپنی کوئی حقیقت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حقائق کی روشنی میں اس روایت کا تنقیدی جائزہ لینے سے یہ کھوکھلا محل ایک ہی ضرب سے ڈھے جائے گا۔

12۔ اگر یہ واقعہ سچ ہوتا تو نبی اکرم ﷺ کے منصبِ نبوت پہ فائز ہونے کے اعلان پر اکابرین قریش اور خصوصاً ابو طالب اسلام قبول کرنے سے باز نہ رہتے۔

13۔ اگر اس قصے میں واقعی کوئی سچائی ہوتی تو اسلامی تاریخ کی کتابیں اس راہب کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بیانات سے بھری ہوتیں۔ لیکن اُس وقت کی اسلامی تاریخ میں اس کا تذکرہ کہیں بھی موجود نہیں ہے۔

14۔ اس روایت کے آخری حصے میں درج ہے کہ اس راہب کے اصرار پر ابو طالب نے اس مستقبل کے نبی لڑکے کو ابو بکرؓ و بلالؓ کے ہمراہ واپس بھیج دیا۔ یہ اس قصے کے مکمل جھوٹ ہونے کا واضح ثبوت ہے۔ حضرت ابو بکرؓ عمر میں نبی کریمؐ سے دو یا تین سال چھوٹے تھے۔ اگر مستقبل کے اس پیغمبر کی عمر اُس وقت ۹ سال ہوتی تو ابو بکرؓ صرف چھ سال کے ہوتے۔ اور اگر اُن کی عمر مبارک ۱۲ سال ہوتی تو ابو بکر اُس وقت نو سال کے کے ہوتے۔ اس میں گھڑت کہانی کا مصنف یہ بات بھول گیا کہ ابو بکرؓ نبی کریمؐ سے عمر میں چھوٹے تھے۔ جیسا کہ تاریخ میں مذکور ہے۔ ابن سعد روایت بیان کرتے ہیں:

''محمد بن عمر بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے شعیب بن طلحہ سے سنا، جنھوں نے یہ بیان کیا کہ ابو بکر الصدیقؓ کے ایک بیٹے سے جس نے کہا ''بلالؓ اور ابو بکرؓ ہم عمر تھے۔ محمد بن عمر کہتے ہیں۔ ''یہ بات صحیح ہے اور یہ ثابت ہے کہ ابو بکرؓ ۱۳ھ میں فوت ہوئے۔'' (۲۲)

فن اسماء الرجال کے مستند ترین امام حافظ ذہبیؒ نے حضرت ابو بکرؓ کی حیات مبارکہ کے مختصر حالات بیان کیے ہیں. وہ کہتے ہیں:

''الصدیق ۱۳ھ میں ماہ جمادی الاخیرہ کے آغاز سے آٹھ روز قبل فوت ہوئے۔ اور ان کی عمر ۶۳ سال تھی'' (۲۳)

مذکورہ صدر روایت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کو مستقبل کے نبی لڑکے کے ساتھ حفاظت کی غرض سے واپس گھر بھجوانے کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی۔

محسوس ہوتی ہے۔ اور اس کے علاوہ ابو طالب کے متعلق یہ کہیں بھی ذکر نہیں کیا گیا کہ آپ نے کسی تجارتی سرگرمی میں حصہ لیا ہو۔ پیشے کے اعتبار سے وہ عطار تھے۔ اُن کے متعلق یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ لنگڑاتے تھے۔ (۲۱)

2۔ اگر یہ بات سچ بھی ہو کہ بحیرہ اتنا بڑا عالم اور منصوبہ ساز ہے کہ اسی نے محمدؐ کی نبوت کا منصوبہ تیار کیا تو مسیحیت کے اس عظیم محسن کے متعلق بہت سا مواد مسیحی تاریخ میں موجود ہوگا۔ اس کی زندگی اور کارناموں کے بارے میں کئی جلدیں لکھی گئی ہوں گی۔ جبکہ (حقیقت یہ ہے کہ) جیسا کچھ بھی اُس کے بارے میں بیان کیا گیا ہے وہ سب کچھ اسلامی تاریخ کی ایک کمتر درجے کی روایت سے مستعار ہے۔

3۔ بحیرہ راہب نے مستقبل کے نبی ہی کو چنا اور سردارانِ قریش کی موجودگی میں کہا کہ یہ لڑکا تمام جہانوں کا رہبر اعظمؐ تمام جہانوں کے پروردگار کا رسول اور رحمتہ للعالمین بنے گا۔ یہ سردار اس بات کے گواہ ہوں گے اور انھوں نے اس غیر معمولی واقعے کا تذکرہ واپس آ کر ضرور کیا ہوگا۔ اور یہ واقعہ پورے شہر کا موضوع بحث بن گیا ہوگا۔ کچھ سالوں بعد جب وہ بیت اللہ میں صبح سویرے نمودار ہوئے اور حجر اسود کی تنصیب کا تنازعہ ان کے ہاتھوں حل ہونا تھا تو لوگوں کو یہ کہنا چاہیے تھا کہ تمام جہانوں کے پروردگار کا رسوؐل آ پہنچا، تمام مخلوقات کا رہنما آ گیا، رحمتہ للعالمین نمودار ہوئے۔ ہم بڑی خوشی کے ساتھ اس کے فیصلے کو قبول کرتے ہیں۔ لیکن تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ اُن میں سے کسی ایک نے بھی آپ کو اس لقب کے ساتھ نہیں پکارا بلکہ وہ بولے کہ امین آ رہا ہے۔ جب آپ نے اپنے نبوت کے منصب پر فائز ہونے کا باقاعدہ اعلان فرمایا تو ہر کوئی بھاگم بھاگ آیا۔ اور آپ سے اپنی وفاداری کا یقین دلاتا۔ تاریخ میں اس امر کا تذکرہ ضرور ہوتا کہ آپ پر ایمان لانے والے اس چیز کا اعلان کرتے کہ ہم پہلے ہی سے جانتے تھے کہ یہ نبی ہیں اور پہلے ہی سے ان کی نبوت کے اعلان کے منتظر تھے۔

4۔ جب بحیرہ سے دریافت کیا گیا کہ اس نے کیسے جانا کہ یہ لڑکا ایک دن نبوت سے سرفراز ہوگا۔ تو اُس نے جواب دیا کہ میں نے تمام درختوں اور پتھروں کو ان کے سامنے جھکتے ہوئے دیکھا۔ اگر درحقیقت ایسا ہوتا تو آپ کو جاننے والے مکہ اور دوسرے علاقوں کے رہنے والے لوگ اس چیز سے واقف ہوتے۔ یہ ایک غیر معمولی، مافوق الفطرت عام طور پر نظر نہ آنے والا منظر ہے۔ اور عام لوگوں کی نگاہ سے اوجھل نہیں رہ سکتا۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس قافلے کے مسافر جو آپ کے ساتھ سینکڑوں میل تک سفر کرتے رہے، اس اہم منظر کو محسوس کرنے میں ناکام رہے۔ اور صرف بحیرہ راہب ہی یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ سکا۔ ایسی بات ہوتی تو بائبل میں پیغمبر اسلام کا یہ معجزہ انھی علامات کے ساتھ ضرور مذکور ہوتا۔ لیکن بائبل میں نبیوں کے متعلق ایسی علامت کہیں بھی نہیں ملتی۔ اس روایت کے مشکوک ہونے کے لیے یہ ایک بہت بڑا ثبوت ہے۔

15۔ جہاں تک حضرت بلالؓ کا تعلق ہے، وہ غالباً اس وقت تک پیدا بھی نہیں ہوئے ہونگے۔ ابن سعد کے بقول:

''بلالؓ دمشق میں ۲۰ھ میں فوت ہوئے اور نہیں باب الصغیر کے مقام پر دفنایا گیا۔ جب وہ ساٹھ سال سے بھی زیادہ عمر کے تھے۔ اور یہ (بھی) کہا جاتا ہے کہ وہ ۱۷ھ میں فوت ہوئے۔'' (۲۴)

ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کی بھی یہی رائے ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''وہ ملک شام میں ۱۷ یا ۱۶ھ میں فوت ہوئے اور ۲۰ھ کا بھی ذکر کیا جاتا ہے۔ جب ان کی عمر ساٹھ سال سے زیادہ تھی۔'' (۲۵)

شمس الدین ذھبیؒ نے بھی حضرت بلالؓ کے دمشق میں انتقال ہونے سے متعلق چند روایات بیان کی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''محمد بن ابراھیم تیمی، ابن اسحٰق، ابوعمر الضریر اور یحیٰ بن بکیر وغیرہ سے مروی ہے کہ حضرت بلالؓ دمشق میں ۲۰ھ میں فوت ہوئے۔'' (۲۶)

حافظ جمال الدین المزی نے بھی چند روایات نقل کی ہیں۔ وہ امام بخاریؒ حوالے سے لکھتے ہیں حضرت بلالؓ حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں شام میں فوت ہوئے۔ عمر بن عبداللہ ابن لبرقی روایت کرتے ہیں کہ وہ ۲۰ھ میں فوت ہوئے۔ واقدی اور امر بن علی کہتے ہیں کہ انھوں نے ۲۰ھ میں دمشق میں وفات پائی جب وہ ساٹھ سال سے زائد عمر کے تھے۔ (۲۷)

مذکورہ تمام حوالوں سے بآسانی یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ:

ا۔ نبی اکرمؐ، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت بلالؓ قریباً ۶۳ سال کی عمر گزار کر فوت ہوئے۔

ب۔ نبی کریمؐ ۱۱ھ میں فوت ہوئے۔

ج۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ۱۳ھ میں وفات پائی یعنی نبی کریمؐ کی وفات کے دو سال بعد۔

د۔ حضرت بلالؓ ۱۷ یا ۱۹ھ اور غالب امکان ہے کہ ۲۰ھ میں فوت ہوئے۔
کم از کچھ یا سات سال اور غالباً نو سال بعد۔

ہ۔ جب پیغمبرؐ نو سال کے تھے۔ حضرت بلالؓ پیدا ہی نہیں ہوئے تھے یا پھر وہ ایک یا تین سال کے تھے۔

و۔ جب پیغمبرؐ کی عمر بارہ سال تھی، تو حضرت بلالؓ یا تو پانچ تا سات سال کے ہونگے یا غالب امکان یہ ہے کہ وہ صرف تین سال کے تھے۔

گویا حضرت بلالؓ کو نبی کریمؐ کی حفاظت کی غرض سے بُصریٰ سے واپس مکہ تک کے سفر میں آپ کے ساتھ بھیجا گیا ہو۔ یہ حقائق اس روایت کی استنادی حیثیت کو بہت حد تک مشکوک بنا دیتی ہے۔ مذکورہ صدر دلائل کی روشنی میں ایک بالغ نظر قاری بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے کہ معاندین اسلام کے اس بیان کی کیا حیثیت ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے اپنی دینی تعلیمات ایک مسیحی راہب سے

سیکھیں۔

اس روایت پر روشنی ڈالتے ہوئے عبدالرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ اپنی شرح سنن ترمذی میں لکھتے ہیں:

''اور ہمارے ائمہ نے اس (روایت) کو مبہم گردانا ہے۔ کیونکہ اس وقت نبیؐ کی عمر مبارک بارہ سال تھی اور ابوبکرؓ ان سے دو سال (اور تین ماہ) چھوٹے تھے۔ جبکہ بلالؓ اُس وقت پیدا بھی نہ ہوئے تھے۔ میزان الاعتدال میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ اس روایت کی غیر مقبولیت ظاہر کرنے والی چند وجوہات میں سے ایک وجہ ان کے اپنے الفاظ میں اور اس نے ان کے ساتھ ابوبکرؓ بلالؓ کو بھیجا جبکہ بلالؓ اُس وقت پیدا بھی نہ ہوئے تھے اور ابوبکرؓ ابھی ایک لڑکے تھے۔ اور ذہبی نے ان الفاظ کی وجہ سے اس روایت کو ضعیف (اور نا قابل اعتبار) قرار دیا ہے۔ اور ابوبکرؓ نے ان کے ساتھ بلالؓ کو بھیجا، جبکہ ابوبکرؓ نے ابھی تک بلالؓ کو خریدا ہی نہ تھا۔ (لہذا انہیں اس وقت بلال کسی کو حکم دینے کا کوئی حق نہ تھا) (۔۔۔) اور حافظ ابن القیم اپنی تصنیف زاد المعاد میں لکھتے ہیں: جب وہ بارہ سال کی عمر کو پہنچے ان کے چچا انھیں اپنے ساتھ شام لے گئے، اور یہ بھی روایت کیا جاتا ہے کہ اُن کی عمر اُس وقت صرف نو سال تھی اور یہ واضح طور پر جھوٹی روایت ہے۔ کیونکہ بلال ابھی اس دنیا میں آئے ہی نہ تھے۔ اور اگر وہ زندہ ہوتے بھی تو ابوبکرؓ کے ساتھ (ان کے غلام) نہ ہوتے۔'' (۲۸)

مذکورہ صدر روایت میں مذکور ہے کہ اس راہب کے مسلسل اصرار پر اس مبعوث ہونے والے نبی لڑکے کو ابوبکرؓ و بلالؓ کی زیر نگرانی واپس مکہ بھیج دیا گیا۔ کیونکہ اگر وہ بازنطینی علاقے میں لائے جاتے تو ان کی زندگی کو شدید خطرہ تھا۔ اُس علاقے کے مذہبی علما انھیں پہچان لیتے اور انھیں قتل کر دیتے۔ ابوبکرؓ و بلالؓ اُن کے سفر میں ان کا ساتھ دینے کو نہ بھیجے گئے تھے اور نہ ہی یہ کوئی تفریحی دورہ تھا۔ یہ محض بے وقوفی ہے اور بالکل نا قابل یقین کہ ابو طالب جو اس لڑکے کو اپنے بچوں سے بھی زیادہ تھا محبوب رکھتے تھے۔ انھیں محض دو کم عمر لڑکوں کی سرپرستی میں دے دیں؛ ان میں سے ایک آپ سے تین سال چھوٹا اور دوسرے (یعنی حضرت بلالؓ) نے یا تو ابھی پیدا ہونا تھا۔ (اگر نبی کی عمر اُس وقت نو سال تھی)، یا وہ دو سال کے ایک دودھ پیتے بچے ہوتے۔ اس امر کی وضاحت بہت مشکل ہے کہ کیسے ان فاضل مستشرقین نے اس اختراع شدہ روایت کو اپنی تصانیف میں جگہ دی حالانکہ بجا طور پر وہ محقق علما مانے جاتے ہیں؛ اور اس میں کوئی شک کی بات بھی نہیں ہے۔ انھوں نے اپنے ہوشیار اور اعلیٰ قلم کی مدد سے اس من گھڑت روایت کی بنیاد پر پورا محل تعمیر کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن یہ اُن کی خواہشاتی سوچ تھی جس نے اُن کو علم کی دنیا میں ایسے کم تر مقام تک پہنچا دیا۔

16۔ تقریباً پچیس سال کی عمر میں جب آپ جوان ہو چکے تھے، آپؐ نے خدیجہؓ کے سامان تجارت کے ہمراہ شام کا سفر کیا۔ اگر آپ کو معلوم ہوتا کہ یہ زمین اور اس کے باشندے ان کے اتنے دشمن ہیں اور یہ کہ آپؐ کو دیکھتے ہی واضح علامتوں

کی مدد سے وہ آپؐ کو پہچان جائیں گے، تو آپ کبھی بھی یہ سفر نہ کرتے۔ لیکن حضرت خدیجہؓ کی جانب سے سامان تجارت لے جانے کی تجویز آنے پر آپ نے جھجک کا مظاہرہ نہ کیا، اور پورے ارادے کے ساتھ اسے قبول کیا۔ اور ان محققین کے لیے حیرت انگیز امر یہ ہے کہ آپؐ پر کسی نے ہاتھ تک نہ اٹھایا۔ آپؐ ایک کامیاب تجارتی سفر کے بعد بحفاظت واپس لوٹ آئے۔

17۔ اس روایت میں ایک اور حیرت انگیز بات درج ہے کہ کسی بھی موقع پر راہب مبعوث ہونے والے نبی لڑکے سے براہ راست مخاطب نہیں ہے۔ اس پورے مکالمے میں راہب اس لڑکے کے لیے صیغۂ غائب یا اسم اشارہ استعمال کرتا ہے۔ اس پوری روایت میں کسی بھی موقعہ پر محمدؐ کے لیے مخاطب کا صیغہ استعمال نہیں ہوا۔ یہ چیز اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ راہب یہ بات سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ اس عمر کا اور ایسے غیر تعلیم یافتہ ماحول سے تعلق رکھنے والا لڑکا اس کے بیان کو سمجھ سکنے کے قابل ہوگا۔

اس مقالے کے اختتام پر کچھ مستشرقین کی چند متوازن آرا کا مطالعہ فائدہ مند ہوگا۔ John B. Noss اور David S. Noss اپنی قابل ستائش کتاب ''Man's Region'' میں لکھتے ہیں:

"(...). The venerable tradition that he learned about Judaism and Christianity during caravan trips to Syria, the first when he was twelve in the company of Abu Talib and the second when he was twenty-five and in the employ of Khadija, whom he subsequently married, must be set aside as untrustworthy." (۲۹)

''قابل تعظیم (سمجھے جانے والی یہ) روایت کہ آپ (نبی کریم ﷺ) نے یہودیت اور مسیحیت کے متعلق شام کے سفروں کے دوران میں سیکھا۔ پہلا وہ (سفر) جب آپ بارہ سال کے تھے اور ابو طالب کے ہمراہ تھے اور دوسرا جب آپ پچیس سال کے تھے اور خدیجہؓ کے ملازم کی حیثیت سے گئے اور جن سے آپ نے بعد میں شادی کر لی، یہ روایت نا قابل اعتبار ہونے کی وجہ سے رد کر دینی چاہیے۔''

ایک اور صحیح الفطرت مستشرق تھامس کارلائل بھی اس موقف کی تردید کرتے ہیں کہ ہادی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے سوا کسی راہب یا عالم سے اکتسابِ علم وفیض کیا ہے۔ تھامس کارلائل کے اپنے الفاظ درج ذیل ہیں:

"I know not what to make of that Sergius [Bahira or Buhayra, whatsoever the pronunciation be, has also been called as Sergius], the Nestorian Monk whom Abu Thalib and he are said to have lodged with; or how much any monk could have taught one still so young. Probably

enough it is greatly exaggerated, this of Nestorian Monk. Mahomet was only fourteen [accordingto the tradition he was either only nine or, at the most, twelve]; had no language but his own: much in Syria must have been a strange unintelligible whirlpool to him. " (۳۰)

مذکورہ واقعہ کی سند میں پائے جانے والے سقم سے قطع نظر کرتے ہوئے، درایتی معیارات کے ذریعے کیا جانے والا جائزہ اس بات کا واضح اشارہ دیتا ہے کہ اس واقعے کی روایت کسی راوی کی غلط فہمی کا نتیجہ ہوسکتا ہے۔ یہ امکان بھی موجود ہے کہ اسلام کے مآخذ کو کھوکھلا ثابت کرنے کے لیے کسی عاقبت نااندیش نے فرضی واقعہ اختراع کر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب کردیا ہو۔ تاہم مذکورہ دلائل کی موجودگی کے باوجود راقم اس امکان کو رد نہیں کرتا کہ کسی بھی تحقیقی کاوش میں غلطی کا احتمال بہر حال موجود رہتا ہے۔ اسلام کا اصل حسن ہی دلیل کی حاکمیت کا اظہار ہے۔ اس رائے کے برعکس اگر کوئی مضبوط دلیل سامنے آتی ہے تو اسے بصد خوشی و احترام تسلیم کیا جائے گا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ الشوریٰ۴۲:۵۲ ۲۔ الاحقاف۴۶:۹

۳۔ W. Montgomery Watt, Muhammad Prophet and Statesman, Oxford University Press, 1961, 40

۴۔ Marshall G. S. Hodgson, The Venture of Islam, The University of Chicago Press, Chicago & London, Vol 1, Book 1, 1974, 161

۵۔ الشوریٰ ۴۲:۱۴ ۶۔ امام ترمذی، جامع، کتاب المناقب، باب ابتداء نبوت، حدیث ۱۵۵۲

۷۔ شبلی نعمانی، سیرۃ النبیؐ، الفیصل پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۱ء، ۱۱۹/۱

۸۔ اُسدُ الغابۃ، دارالاحیاء التراث العربی، بیروت، ۲۴۵/۳

۹۔ ایضاً، ۲۴۶/۳ ۱۰۔ سیر أعلام النبلاء، مؤسسہ الرسالۃ، بیروت، ۱۹۹۲ء، ۳۹۷/۲

۱۱۔ الاصابہ فی تمیز الصحابہ، مکتبہ الریاض الحدیثہ، ۱۹۷۸ء، ۳۵۹/۲

۱۲۔ الطبقات الکبریٰ، دار بیروت، بیروت، ۱۹۵۷ء، ۱۰۵/۴--۱۱۵

۱۳۔ عسقلانی، تقریب التہذیب، دارنشر الکتب الاسلامیہ، لاہور، ۱۹۸۵ء، ۳۹۷

۱۴۔ ابن الاثیر، أسد الغابۃ، ۲۴۶ ۱۵۔ ذہبی، سیر اعلام النبلاء، ۳۸۲/۲

۱۶۔ مزی، جمال الدین یوسف، تہذیب الکمال فی اسماء الرجال، مؤسسہ الرسالہ، بیروت، ۱۹۹۲ء، ۱۴۴/۳۳

۱۷۔ مزی، ۴۹۱/۳۲ ۱۸۔ ایضاً، ۳۳۷/۱۷

۱۹۔ خطیب بغدادی، تاریخ بغداد، مکتبہ السّلفیہ، مدینہ منورہ، س ن، ۳۶۵/۱۲

۲۰۔ امام ترمذی، السنن، کتاب المناقب، باب۳، حدیث ۳۶۲۹

۲۱۔ ابن قتیبہ، المعارف، ۲۵۲، بحوالہ حبیب الرحمٰن کاندھلوی، مذہبی داستانیں اوران کی حقیقت، ۱۱۰

۲۲۔ الطبقات الکبریٰ، ۲۳۸/۱ ۲۳۔ ذہبی، تاریخ الحفاظ، دارالکتب العلمیہ، بیروت، س ن، ۵/۱

۲۴۔ أسد الغابہ، ۲۰۹/۱ ۲۵۔ تقریب التہذیب، ۴۸

۲۶۔ ذہبی، تاریخ الاسلام، دارالکتب العربیہ، بیروت، ۱۹۸۷ء، ۲۰۵

۲۷۔ تہذیب الکمال، ۲۹۰/۴ ۲۸۔ مبارکپوری، عبدالرحمٰن، تحفۃ الاحوذی، ضیاء السنہ، فیصل آباد، س ن، ۲۹۶/۴

۲۹۔ John B. Noss/David S. Noss, Man's Religion, Macmillan Publishing Company , New York, 1984, 501.

۳۰۔ Thomas Carlyle, On Heroes Hero-Worship and the Heroic in History, London, Oxford University Press, 1065, 68.